دو سال ہونے کو آئے

محترم عرفان صدیقی

مجھے آج پھر افغانستان یاد آرہا ہے۔ افغانستان کا وہ مرد جری یاد آرہا ہے جو زمستانی موسم کی یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا اپنے گھر سے نکلا اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ آج سحری کے بعد جب اندھیرا اور اجالا گلے مل رہے تھے اور جب مارگلہ سے آتی ٹھنڈی ہوا اسلام آباد کی کشادہ سڑکوں اور کھلے پارکوں کو بدلتی رت کا سندیسہ دے رہی تھی تو مجھے افغانستان اور اس کا درویش مزاج امیر المومنین بہت یاد آئے۔ میں کمبل کی بکل مار کر اپنے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر لحظہ لحظہ پھیلتی روشنی اور لمحہ لمحہ پگھلتی تاریکی کو دیکھتا رہا۔ گھر کے باہر لگا چیل کا درخت جوان ہو چلا تھا۔ اس کی شاخیں اور شاخوں کے کنارے اگے سبز بالوں کے گچھے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

میں نے اپنے آپ کو مختلف سوچوں میں الجھانے اور بے آب و رنگ زمین سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن قندھار کا مرد جری تو جیسے میری کھڑکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اسے ملے، اسے دیکھے اور اس کی باتیں سنے آٹھ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن میں آج تک اپنے ہاتھوں میں اس کے فولاد جیسے سخت اور آتش گل کی طرح دہکتے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتا ہوں۔ میرے کانوں میں ابھی تک اس کی نرم و شیریں تقریریں رس گھول رہی ہے جو اس نے قندھار کے ایک جنگ زدہ ریسٹ ہاؤس کے بڑے کمرے میں کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اے ڈی سی تھا نہ ملٹری سیکرٹری، نہ پروٹوکول آفیسر، نہ مرصع فائل میں سجی اعلیٰ اور نیٹ پیپر پر لکھی تقریر، نہ پریس ریلیز تیار کرنے والا انفارمیشن آفیسر، نہ پرنسپل اسسٹنٹ، نہ باڈی گارڈز کا غول، نہ پولیس کے دستے، نہ وزیروں کا مجمع، نہ اعلیٰ افسروں کے جتھے، نہ راستہ بنانے والے اہلکار، نہ نعرے لگانے والے پیشہ ور، نہ تالیاں پیٹنے والے چاپلوس، نہ ٹیلی ویژن کیمروں کا ہجوم، نہ فوٹوگرافروں کا لشکر، نہ اخبار نویس نہ کوئی اور۔ وہ آیا تو نہ کوئی بگل بجا، نہ غوغا ہوا، نہ شور اٹھا، نہ ہلچل مچی، نہ ہنگامہ بپا ہوا، نہ کسی کو اپنی جگہ سے اٹھایا گیا، نہ اس کے لیے کوئی خاص کرسی رکھی گئی۔ بس وہ درویشانہ انداز غنا کے ساتھ آیا، بوسیدہ صوفوں کی لمبی قطار پر بیٹھے لوگوں نے ادھر اُدھر کھسک کر اسے جگہ دی اور وہ بیٹھ گیا اور اپنی چادر کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لی۔

مجھے اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ، اس کے لہجے کا ایک ایک زاویہ اور اس کے اسلوب کا ایک ایک رنگ ابھی تک یاد ہے۔ وہ برسوں عرصہ جہاد میں رہا۔ اس کا سارا لڑکپن افغانستان کے پہاڑوں، میدانوں، گھاٹیوں اور وادیوں میں گزرا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ جوانی زرتاب صبح کب طلوع ہوئی اور کس لمحے سرمگیں شام کے افق میں غرق ہو گئی۔ شانوں پر زلفیں بکھرنے کے پورے موسم میں اس کے ایک کندھے پر بھاری سیاہ چادر تھی اور دوسرے پر بندوق۔ موسموں کی صعوبتوں اور جنگوں کی سختوں نے اس کا پورا بدن آہن فولاد میں ڈھال دیا تھا لیکن اس کی گفتگو میں آبشاروں کی نغمگی تھی۔ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ سچ بول رہا تھا۔ نہ بڑائی، نہ تکبر، نہ تفاخر، نہ اپنے کسی کارنامے کا تذکرہ، نہ حریفوں پر تنقید، نہ کوئی نشیب، نہ کوئی فراز، نہ خطیبانہ گھن گرج، نہ واعظانہ پیچ و خم، نہ ناصحانہ رعونت، نہ مبلغانہ بالادستی، اس دن مجھے اقبال بہت یاد آیا تھا اور "مسجد قرطبہ" کے کتنے ہی شعر شبستانی جگنوؤں کی طرح چمک اٹھے تھے۔ مجھے اس دن پہلی مرتبہ حلقہ یاراں میں بریشم کی اور رزم حق و باطل میں فولاد بن جانے والے مومن کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ سمجھ میں کیا آیا تھا، شعر کی جامع تفسیر ایک زندہ

قالب میں ڈھل کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ امیر المؤمنین ملا محمد عمر کا افغانستان، اسیر المنافقین حامد کرزئی کے افغانستان سے بہت مختلف تھا۔ تب افغانوں کو خبر تھی کہ اس ملک میں کوئی حکومت ہے۔ شرق وغرب کے کسی بھی گوشے میں بیٹھے شخص کو معلوم تھا کہ وہ بے مہار نہیں۔ قندھار کے حجرے میں بیٹھے درویش کا حکم افغانستان کے ہر شہر، ہر قصبے، ہر گاؤں پر یکساں لاگو تھا۔ میں نے اس افغانستان کی کچھ جھلکیاں اپنی چشم حیرت سے دیکھی تھیں اور مہینوں اس واہمے میں مبتلا رہا تھا کہ شاید کسی جادونگری کا طلسم میری آنکھوں میں آن بسا ہے۔ اخبارات آئے تو میں یکایک قندھار سے واپس پلٹ آیا۔ اخباروں کی شہ سرخیاں کہہ رہی تھیں کہ افغانستان کے متعدد صوبوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ ان لڑائیوں میں ستر کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوگئے ہیں۔ بیشتر لڑائیاں ایسے گروہوں کے درمیان ہو رہی ہیں جو حکومت میں شریک ہیں۔ دوستم اور عطا محمد کے درمیان تازہ ترین معرکے میں ۲۰ فوجی ہلاک ہوگئے۔ ہلمند میں افغان فوج اور پولیس میں جنگ جاری ہے۔ امن وامان غارت ہو چکا ہے اور عام آدمی کی ہر سانس سولی پہ ٹنگی ہے۔ امریکا نے وار لارڈز کو کھلا چھوڑ دیا ہے اور ٹکڑیوں میں بٹا افغانستان سوکھے پتوں کے ڈھیر کی طرح دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ تعمیر وترقی اور خوشحالی وآسودگی کے سارے خواب کم نصیب زمین پر اترنے سے پہلے ہی بخیل بادلوں کی طرح چھٹ گئے۔

یہ ہے وہ افغانستان جو جارج بش نے تعمیر کیا ہے۔ ہم نے بھی ملا محمد عمر کے افغانستان کو ملبے کا ڈھیر بنانے اور شمالی اتحاد کے قلعے کی تعمیر کے لیے اینٹ گارا ڈھونے کا کام کیا اور آج بھی یہ مشقت بغیر کسی مزدوری کے اٹھائے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس خیال سے ایک ایک مسام تنور کی طرح دہک اٹھتا ہے کہ ہم نے کن فرشتہ فعال لوگوں کے خیموں کی طنابیں کاٹ کر کیسے درندہ صفت گروہ کو افغانستان پر مسلط کر دیا۔ طالبان کے بارے میں دشمنی کی حد تک منفی رائے رکھنے والی معروف خاتون کرسٹینا لیمب اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے "جنرل دوستم پہلوان رہ چکا ہے وہ رقاصاؤں اور سکاچ وہسکی کا رسیا ہے۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ اور اس کی گردن نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت قہر وغضب کا تاثر موجود رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر کھانے کے بعد چند انسانوں کا بے رحمانہ قتل اس کا پسندیدہ مشغلہ ہو۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو ٹینکوں تلے روند دیتا ہے۔ ازبکوں کا کہنا ہے کہ اس کا وحشیانہ قہقہہ اتنا دہشت ناک اور روح کو لرزا دینے والا ہوتا ہے کہ خوف کے مارے انسان اپنی جان گنوا سکتا ہے۔"

آج رشید دوستم سمیت انسانی اقدار کو کند چھری سے ذبح کرنے والا سفاک گروہ کابل وقندھار پر قابض ہے۔ افغانستان کو ایک ایسا جہنم زار بنا دیا گیا ہے جس میں اغوا، قتل، ڈاکہ زنی اور آبروریزی جیسے جرائم معمول بن گئے ہیں۔ وہ جرائم جنہیں طالبان نے جڑوں سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ حامد کرزئی کو دنیا کے خوش پوش حکمرانوں میں شامل ہونے کا اعزاز ملا ہے۔ اس بستی کا خوش پوش حاکم جس کے باسیوں کے پاس ستر پوشی کے لیے دو گرہ کپڑا تک نہیں۔ ملا محمد عمر بھی افلاس کا عذاب ختم نہیں کر سکا تھا، لیکن اس نے حاکم اور رعایا کی تمیز مٹا کر درد مشترک کی اسلامی روایت زندہ کر دی تھی۔ اسی روایت نے فاقہ زادہ افغانیوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی زمستانی ہواؤں کے بے رحم موسم میں جب بستیوں کے بوڑھے، لاٹھی ٹیکتے کھلی دھوپ میں بیٹھتے ہوں گے تو ان کا ایک ہاتھ سایہ کرنے، ان کے بوڑھی آنکھوں پر چھتری تان لیتا ہوگا اور وہ پہروں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر نظریں جمائے رکھتے ہوں گے شاید کوئی بلند قامت شخص مجاہدانہ بانکپن کے ساتھ کندھے پر کالی چادر ڈالے نیچے اتر رہا ہو۔

اب تو اسے گئے دو سال ہونے کو آئے!

☆☆☆